(6) فیض احمد فیض

(۱۹۱۰ء۔۱۹۸۵ء)

تعارف: فیض احمد فیض ۱۳ فروری ۱۹۱۰ء میں کالا قادر سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام بیرسٹر سلطان محمد تھا۔ بنیادی طور پر رومانوی شاعر تھے۔ انھوں نے ترقی پسند تحریک کے زیر اثر عشق سے انقلاب کی طرف قدم بڑھایا اور جذبہ و نظریہ دونوں سے نباہ کرنے کی کوشش کی۔ بعض نقاد کہتے ہیں کہ عاشقی فیض کی عبادت ہے اور ترقی پسندی ان کا فرض ہے۔ جب فیض اپنے اندر کی آواز سنتے تو وہ بے مثل نظم وجود میں آتی جو اقبال اور جوش کی نظم سے نوعیت اور مزاج کے اعتبار سے مختلف تھی۔ فیض نے اردو غزل اور نظم دونوں کو متاثر کیا۔

ایم اے انگریزی اور ایم اے عربی کی ڈگریاں رکھنے والے تعلیم یافتہ فیض کو حکومت روس نے ۱۹۶۰ء میں لینن امن ایوارڈ سے نوازا۔ ایم اے۔ او کالج امرتسر میں پروفیسر بھی رہے۔ حکومت پاکستان کی وزارت تعلیم کے مشیر بھی رہے۔ ''نقش فریادی''، ''دست صبا''، ''زنداں نامہ''، ''دست تہ سنگ''، ''سروادیِ سینا''، ''شام شہر یاراں''، ''مرے دل مرے مسافر''، ''میزان'' اور ''صلیبیں مرے دریچے میں'' ان کی مشہور تصانیف ہیں۔ جب کہ کلیات کا نام ''نسخہ ہائے وفا'' ہے۔

جدید شاعری کا یہ منفرد شاعر، کسانوں اور مزدوروں سے سچی محبت اور ان کی کہانیاں بیان کرنے والا، فیض ۲۰ نومبر ۱۹۸۵ء کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔

ویران ہے مئے کدہ، خم و ساغر اداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے

غزل 1

شعر 1 نہ گنواؤ ناوکِ نیم کش، دلِ ریزہ ریزہ گنوا دیا — جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو، تنِ داغ داغ لُٹا دیا

حل لغت: نہ گنواؤ: مت ضائع کرو — ناوکِ نیم کش: آدھا کھنچا ہوا تیر — دل ریزہ ریزہ: پاش پاش دل
سنگ: پتھر — سمیٹ لو: بچالو — تن داغ داغ: زخموں سے چور جسم

مفہوم: اے مخاطب! اپنے ادھ کھنچے ہوئے نشتر میرے پاش پاش دل پر مت ضائع کرو۔ جو پتھر باقی بچ گئے ہیں انھیں سمیٹ لو کیوں کہ میں اپنا زخموں سے چُور بدن قربان کر چکا ہوں۔

تشریح:

سرزمین اقبال پر جنم لینے والے ایک اور عظیم شاعر جسے زمانے نے ثانی اقبال کے نام سے پکارا یہی فیض جن کی شاعری کا فیض باعث انقلاب ہے۔ فیض احمد فیض اپنی مشہور غزل کے تشریح طلب شعر میں اپنے محبوب سے مخاطب ہے کہ اے محبوب اپنے ادھ کھنچے ہوئے تیر میرے دل پر مت آزماؤ کیوں کہ میں تو اپنا صدموں سے نڈھال دل گنوا بیٹھا ہوں اور تمھارے پاس مجھ پر آزمانے کے لیے جو مزید پتھر بچے ہیں انھیں بچا کر رکھ لو کیوں کہ یہ پتھر مجھے مارنا بے سود ہیں۔ کیوں کہ میں تو جان کنی کے عالم میں ہوں اور چند لمحوں بعد تمھارے جور و ستم کے سامنے ہار مانتے ہوئے اس دنیا کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دوں گا۔ دوسرے الفاظ میں شاعر نے محبوب کی طرف سے دیے گئے دکھوں اور غموں کا تذکرہ کیا ہے کہ محبوب نے مجھ پر اس قدر مصائب ڈھائے ہیں کہ میرا دل ٹکڑے ٹکڑے اور جسم زخموں سے چور چور ہو چکا ہے۔ یہ زخم ستم محبوب کے عینی شاہد ہیں۔ اور اب محبوب مجھ پر اپنے ادھ کھنچے تیر

آزما رہا ہے۔ یہاں شاعر نے محبوب کی آنکھوں کو تیر قرار دیا ہے جو کہ آدھی کھلی ہوئی ہیں۔ یاد رہے کہ ادھ کھلی ہوئی آنکھیں روایتی طور پر عاشقوں کے لیے زیادہ ستم ڈھانے اور مست کر دینے والی واقع ہوئی ہیں۔ بقول میر:

میرؔ اُن نیم باز آنکھوں میں   ساری مستی شراب کی سی ہے

گویا شاعر محبوب کی نظر کا گھائل ہے:

نظر سے قتل کر ڈالو نہ ہو تکلیف دونوں کو   تجھے خنجر اٹھانے کی مجھے گردن جھکانے کی

لیکن اس شعر کو غزل کی شدید داخلیت پر محمول نہیں کرنا چاہیے۔ دراصل یہ حقیقی شعر ہے۔ فیض ترقی پسند شاعر تھے اور اشتراکی نظریات کے مروج کرنے کے خواہاں اور مزدور طبقے کے روحِ رواں تھے۔ لیاقت باغ قتل کیس اور جنرل (ر) ایوب کے خلاف سازش کے جرم میں منٹ گمری سنٹرل جیل اور حیدرآباد میں قید بامشقت برداشت کرتے رہے۔ ساری زندگی وہ حکمرانوں سے برسرِ پیکار رہے۔ جس کے نتیجے میں مسلسل قید و بند، سزا و تکالیف، محنت و مشقت سے سامنا ہوتا رہا۔ طبقہ حکمراں اور طبقہ امراء اُن کے نظریات کے باعث، اُن سے شدید متنفر تھا اور طرح طرح کی تکالیف اُن پر ڈھاتا رہا۔

بہر حال فیض ان ظالم لوگوں یعنی حکمرانوں اور امراء سے جو اُس کے نظریات کے مخالف ہیں۔ مخاطب ہے کہ اے ظالمو اپنے ادھ کھنچے ہوئے تیر کمان سے اتار لو کیوں کہ میرا دل لٹ چکا ہے۔ مجھے مزید پتھر مت مارو کیوں کہ میرا جسم مکمل طور پر زخمی ہو چکا ہے۔ اور میرا سارا جسم تمھارے ظلم کا گواہ ہے اور اب میں چند گھڑیوں کا مہمان ہوں۔ لہٰذا اپنے نشتر مجھ پر مت آزماؤ۔ گویا شاعر مصائب اور تکالیف میں ہنستے ہوئے جان ہار بیٹھا ہے اور اب نزع کے عالم میں وہ ظالموں سے ملتمس ہے کہ اب یہ طوفانِ مصائب روک لو تا کہ میری جان آرام سے نکل سکے۔ تمام عمر تو تم نے مجھ پر پتھر ہی برسائے ہیں۔ بقول احمد ندیم قاسمی:

عمر بھر سنگ زنی کرتے رہے اہلِ وطن   یہ الگ بات کہ دفنائیں گے اعزاز کے ساتھ

عاشق کا تو بقولِ شاعر یہ حال ہو گیا ہے کہ:

دل میں لاکھوں زخم ہیں، زخموں میں لاکھوں تیر ہیں   اب میری حالت یہ ہے زندہ ہوں نہ مردوں میں ہوں

شعر 2 مرے چارہ گر کو نوید ہو، صفِ دشمناں کو خبر کرو   وہ جو قرض رکھتے تھے جاں پر، وہ حساب آج چکا دیا

حل لغت: چارہ گر: معالج، طبیب   نوید: خوش خبری   چکا دیا: ادا کر دیا

مفہوم: میرے طبیب کو یہ خوش خبری سناؤ اور دشمنوں کو نوید دو کہ میں نے موت کی آغوش میں جا کر جان کے قرض کا حساب بے باق کر دیا۔

تشریح:

فیض احمد فیض معروف ترقی پسند شاعر تھے۔ تشریح طلب شعر کو اُن کا مرثیہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ وہ ایک ایسا شاعر ہے جو اپنا مرثیہ خود لکھتا ہے۔ اپنی جدوجہد اور کوشش کے دوران فیض کو دو قسم کے لوگوں سے واسطہ پڑتا رہا۔ اول قسم کے وہ لوگ جو فیض پر ظلم و ستم روا رکھتے تھے۔ یہ لوگ اس پر ہر قسم کا ظلم روا رکھتے۔ بے پناہ مصائب دیتے۔ دراصل یہ طبقہ امرا اور حکمران طبقہ تھا۔ یہ لوگ فیض کے نظریات سے یکسر بے نیاز واقع ہوئے تھے۔ عدل و انصاف کی سیاست ان لوگوں کا مطمحِ نظر نہ تھا۔ دوسری قسم کے وہ لوگ جو فیض کے حامی تھے۔ اُس کے دکھ درد میں شرکت کرتے اور اس کے زخموں پر مرہم رکھتے۔ اُسے تسلی دیتے اور تشفی فراہم کرتے تھے۔

شاعر کے زیرِ تشریح شعر کو "وصیت" بھی کہا جا سکتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ موت کے بعد میرے بہی خواہوں اور ہم دردوں کو نوید سنا دینا کہ حق پرست اور انصاف کا علمبردار آج چل بسا ہے۔ اب تمھیں اُس کے زخموں پر مرہم رکھنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ آج سے تم مکمل آزاد ہو۔ آئندہ سے تمھیں شاعر کو تسلی و تشفی دینا نہیں پڑے گی۔ نہ ہی حکام کے اس "باغی" کے آلام میں حصہ دار بننا پڑے گا۔ اس طرح شاعر نے اپنی موت کے ذریعے اپنی جان پر موجود قرض بے باق کر دیا ہے۔ اور شاعر کہتا ہے کہ تمھاری وفاؤں کے بدلے ہم نے موت کے ذریعے تمھارے لیے آسانی پیدا کی ہے۔ بقول شاعر:

تم ہم سے روٹھ جاؤ اور زندگی سے ہم ۔۔۔ بدلہ وفا کا دیں گے بڑی سادگی سے ہم

ہم جو کھیلے تو جان پر کھیلے ۔۔۔ کھیل کوئی نہ عمر بھر کھیلے

شاعر مزید کہتا ہے کہ دشمنوں کو یہ خبر کر دو کہ حق کا علمبردار اور تمھارا مخالف اور تمھارا محتسب آج ہمیشہ کے لیے اس دنیا کو خیرباد کہہ چکا ہے۔ یقیناً وہ یہ خبر سُن کر خوش ہوں گے کیوں کہ میں تو اُن کی راہ کا کانٹا تھا اور ہر وقت اُن کی آنکھوں میں چبھتا اور کھٹکتا رہتا تھا۔ انھیں یقیناً خوشی ہوگی کیوں کہ اُن کا احتساب کرنے والا اور اُن کے مظالم کے خلاف آواز اُٹھانے والا آج راہیِ ملکِ عدم ہو چکا ہے۔ وہ جس کے قتل کے درپے تھے وہ خود بخود موت کی نیند سو چکا ہے۔ اور اپنی زندگی تک بلند نصب العین کی ترویج کرنے کے لیے وقف کر دی ہے۔

مختصراً یہ کہ شاعر نے اُن لوگوں کو اپنی موت کی نوید سنائی ہے جو اُس کے بلند نصب العین کی تبلیغ میں رکاوٹ تھے اور اُسے ناپسند کرتے تھے۔

غزل کے خارجی مفہوم کے اعتبار سے اس کا یہ مفہوم ہو سکتا ہے کہ شاعر کی وفاؤں کے عوض محبوب نے مسلسل بے وفائی کی اور وہ شاعر کی چارہ گری سے قاصر رہا۔ دوسری طرف رقیب بھی مسلسل حصولِ محبوب کی راہ میں رکاوٹ تھے۔ شاعر چارہ گر (محبوب) کو یہ خوش خبری دیتا ہے کہ میں نے موت کا مسافر بن کر تمھیں سرخرو کر دیا ہے اور تمھارا بھرم رکھ لیا ہے۔ کیوں کہ حقیقتاً تم نے میرے ساتھ وفا نہیں کی اگرچہ میں عالمِ نزع تک تمھارا محبّ تھا۔ بقولِ میر تقی میر:

جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم ۔۔۔ سو اب اس عہد کو وفا کر چلے

شعر 3 کرو کج جبیں پہ سرِ کفن، مرے قاتلوں کو گماں نہ ہو ۔۔۔ کہ غرورِ عشق کا بانکپن، پسِ مرگ ہم نے بھلا دیا

(بہاول پور 2009ء لاہور 2010)

حلِ لغت:
کج: ٹیڑھا ۔۔۔ سرِ کفن: کفن کا کونا ۔۔۔ گماں: وہم، شک، خیال
بانکپن: غرور، البیلا پن، تکبر، فخر ۔۔۔ پسِ مرگ: مرنے کے بعد

مفہوم:
اے دوستو! مرنے کے بعد پیشانی پر میرا کفن ٹیڑھا کر دینا تا کہ میرے قاتلوں کو یہ خیال نہ آئے کہ مرنے کے بعد اس کا غرور اور بانکپن ختم ہو گیا ہے۔

تشریح:
تشریح طلب شعر میں شاعر اپنے دوستوں سے مخاطب ہے کہ مرنے کے بعد اُس کی پیشانی پر کفن کو ہلکا سا خم دے دیا جائے تا کہ موت کے بعد بھی اُس کا بانکپن ختم نہ ہو جائے۔ شعر میں فیض نے کجکلاہی کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یعنی سر پر ٹیڑھی ٹوپی یا کلاہ پہننا۔ ٹیڑھی ٹوپی کو غرور کا عکاس سمجھا جاتا [illegible] لکھنؤ میں ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو سر پر ٹیڑھی ٹوپی پہنتا

، تا کہ جداگانہ شناخت قائم کر سکیں، یہ لوگ فنِ سپاہ گری کے ماہر تیغ زنی اور نشتر زنی کے شائق تھے۔

گویا اعلیٰ مقاصد اور بلند نصب العین کی اشاعت کے لیے ہر چیز مال و وقت بلکہ جان تک کی قربانی دینا پڑتی ہے۔ جو لوگ اس قربانی سے گریز نہیں کرتے۔ کامیابی بھی اُن سے گریز نہیں کرتی لیکن کسی بھی عظیم نصب العین کی ترویج کوئی آسان امر نہیں۔ ہزاروں لوگ مخالف کا روپ دھار کر نمودار ہوتے ہیں اور اُس شخص کو شدید مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو بلند نصب العین کی تبلیغ کا فریضہ ادا کر رہا ہوتا ہے۔ یہ تمام حربے اس لیے استعمال کیے جاتے ہیں کہ یہ شخص اپنے نصب العین کو چھوڑ دے۔ لیکن اگر یہ شخص ایسا نہیں کرتا تو مخالفین اُس کی جان کے درپے ہو جاتے ہیں تا کہ اُسے قتل کر کے اپنی راہ کا کانٹا مسل دیں۔ بقول حفیظ اثر:

حق پرستی کی سزا جانتا ہوں میں — اس میں چھنتی ہے قبا جانتا ہوں میں

تشریح طلب شعر میں شاعر کی بھی یہی کیفیت ہے۔ وہ اپنے مطمحِ نظر اور نصب العین سے نہیں ہٹا اور مخالفین اُس کی جان کے درپے ہو گئے ہیں۔ تا کہ قتل کے بعد اس کا نصب العین مشتہر نہ ہو سکے اور اس کا غرور و تکبر، البیلا پن و بانکپن ختم ہو جائے۔ مگر شاعر اُن کا یہ مدعا اپنے قتل کے بعد بھی پورا ہونا نہیں دیکھنا چاہتا ہے۔ چناں چہ اس مقصد کے لئے وہ ایک عجیب انداز اختیار کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اے دوستو میرے قتل کے بعد میری پیشانی پر موجود کفن کے حصے کو ہلکا سا خم دے دینا تا کہ مخالفین کو یقین ہو جائے کہ میرا بانکپن جوں کا توں قائم ہے۔ بقول شاعر:

اب بھی دماغ دوستو اپنا ہے عرش پر — گو آسماں نے خاک میں ہم کو ملا دیا

ایک اور شاعر کے الفاظ میں:

غرور گل بدن قائم رہے گا — یہ اپنا بانکپن قائم رہے گا

خارجی مفہوم میں دیکھا جائے تو اس کا مفہوم یہ برآمد ہو سکتا ہے کہ شاعر نے قاتل رقیب کو کہا ہے۔ کیوں کہ رقیب شاعر کی جان کے درپے ہوتا ہے۔ شاعر اپنے احباب سے کہتا ہے کہ قتل کے بعد وہ میرے کفن کا سرا ٹیڑھا کر دیں تا کہ رقیب کو معلوم ہو سکے کہ میرا بانکپنِ عشق ہنوز قائم ہے۔ رقیب نے مجھے اس لیے قتل کیا تھا کہ میرا عشق اور بانکپن ختم ہو جائے گا لیکن ٹیڑھا کفن دیکھ کر اُسے مایوسی ہوگی کہ اس کا فعل لاحاصل تھا۔

چہرہ مایوس پر بھی بانکپن آیا تو ہے — ہم کو ہر حالت میں جی لینے کا فن آیا تو ہے

شعر 4: اُدھر ایک حرف کہ کشتنی، یہاں لاکھ عذر تھا گفتنی — جو کہا تو سن کے اُڑا دیا، جو لکھا تو پڑھ کے مٹا دیا

(بہاول پور 2009ء، لاہور 2010ء)

حل لغت: کشتنی: قتل کیے جانے کے قابل — گفتنی: کہے جانے کے قابل — عذر: بہانہ

سن کے اڑا دیا: سنی ان سنی کر دی

مفہوم: مخالفین کے نزدیک میرا اک اک حرف میرے واجب القتل ہونے پر دلالت کرتا تھا جب کہ میرے پاس بھی لاکھ دلائل تھے لیکن انھوں نے میری بات سنی ان سنی کر دی اور جو لکھ کر بھیجا اُسے کوئی وقعت نہ دی اور پڑھ کر پھاڑ دیا۔

تشریح:

تشریح طلب شعر میں شاعر نے اپنے ساتھ حکام کے سنگ دلانہ برتاؤ کا تذکرہ کیا ہے۔ اعلیٰ مقاصد اور عظیم نصب العین کی ترویج ہمیشہ سے بڑا مشکل کام رہا ہے۔ حق وصداقت کے علمبرداروں کو ہمیشہ زمانے نے دکھ پہنچائے۔ بعض انبیاء کو بھی ظالم لوگوں نے تبلیغ حق کے جرم میں شہید کر دیا۔ ایک اور حقیقت یہ بھی ہے کہ حق کے علمبردار اکثر و بیشتر سادہ، مظلوم، محکوم اور اقتدار سے بے تعلق ہوتے ہیں۔ تاہم اقتدار کو یہ للکارتے ضرور ہیں۔ اور صاحب اقتدار اکثر باطل نظریات کی زد میں پھنسا ہوتا ہے اور حق کے علمبرداروں کو صاحب اقتدار طبقہ ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ شاعر نے بھی یہی بات کی ہے کہ حق وانصاف کی تبلیغ کرنے سے باطل نظریات کے حامل لوگ میرے دشمن ہو گئے۔ گو کہ میرے نظریات مبنی بر حقیقت تھے لیکن ان لوگوں نے یہ گمراہ کن پروپیگنڈا کر دیا کہ میرے نظریات باطل ہیں۔ اور میرے نظریات اس قدر شدید گمراہ کن ہیں کہ میرا ایک حرف ہی مجھے پھانسی دلانے کے لیے کافی ہے حالاں کہ میرا جرم کیا تھا؟ یہی کہ حق وصداقت کی حمایت کرتا تھا اور جذب وحریت کی ترغیب دیتا تھا۔ بقول مولانا ظفر علی خاں:

میں غلاموں کو دیا کرتا ہوں درسِ حریت — میرا پیشہ ہے بغاوت، باغی کہلاتا ہوں میں

شاعر مزید کہتا ہے کہ ان کے پاس اپنے نصب العین اور مقصد کی سچائی کو ثابت کرنے کے لیے بے شمار دلائل موجود تھے۔ لیکن ان کے نظریات کے مخالفین کے پاس قوت، دولت اور اقتدار تھا۔ ان کے مخالفین نشۂ اقتدار میں ان کی کسی بھی دلیل کو سننے کے لیے تیار نہ تھے۔ وہ ان کی باتوں کو کوئی اہمیت نہ دیتے اور سنی ان سنی کر دیتے۔ بقول شاعر

ان نے قصداً بھی میرے نالے کو — نہ سنا ہو گا، گر سنا ہو گا

اور ہم نے اپنے دلائل ونظریات تحریری شکل میں انہیں پیش کیے تو انھوں نے پڑھے بغیر ٹکڑے ٹکڑے کر دیے اور انہیں کوئی اہمیت نہ دی اور اس پر مصر رہے کہ یہ شخص واجب القتل ہے اور دار پر لٹکائے جانے کے قابل ہے اور اسے صفحۂ ہستی سے ہی مٹا دیا جائے۔

خارجی مفہوم یہ ہو سکتا ہے کہ رقیبوں نے محبوب کو شاعر سے اس قدر بدظن کر دیا ہے کہ محبوب اس پر بہت نالاں ہے۔ محبوب کو شاعر کی گفتگو سننا بھی گوارا نہیں۔ جھوٹے الزامات سن کر وہ اس قدر متنفر ہو گیا ہے کہ وہ یہی رٹ لگائے رکھتا ہے کہ اسے قتل کر دیا جائے۔ شاعر کہتا ہے کہ الزامات کی تردید کے طور پر میرے پاس لاکھوں دلیلیں موجود تھیں لیکن محبوب کو میری بات سننا ہی گوارا نہ تھی۔ اس نے میری باتیں عدم توجہی سے سنی اور سنی ان سنی کر دیں۔ مزید برآں ان الزامات سے بری ہونے کے لیے میں نے دل کی باتیں تحریری صورت میں پیش کیں۔ تاہم محبوب نے پڑھ کر اسے پارہ پارہ کر دیا کہ گویا پڑھا ہی نہ ہو۔ بقول شاعر:

میری باتوں پہ غور کیا کرتے — ان کو سننا ہی کچھ گوارا نہیں

بقول صفیر احمد صفیر:

ٹال دیتے ہو یوں ہی ہنس کر میری باتوں کو — میری باتوں میں حقیقت بھی تو ہو سکتی ہے

شعر 5: جوڑ کے تو کوہ گراں تھے ہم، جو چلے تو جاں سے گزر گئے — رہِ یار ہم نے قدم قدم تجھے یادگار بنا دیا

(بہاول پور 2009، لاہور 2010)

حل لغت:

کوہ گراں: بھاری پہاڑ جو اپنی جگہ سے ہل نہ سکے — جاں سے گزرنا: جان دے دینا

رہِ یار: محبوب کا راستہ — قدم قدم: ہر قدم پر — یادگار: یاد رہنے والی چیز

مفہوم: اگر ہم کہیں راستے میں رکے تو ایک بھاری پہاڑ کی مانند تھے اور اگر چل پڑے تو جان تک قربان کردی اس طرح ہم نے قدم قدم پر اس راہ کو یادگار بنا دیا۔

تشریح:

تشریح طلب شعر میں شاعر نے اپنے اعلیٰ مقاصد اور بلند نصب العین کے حصول میں اپنی استقامت کے متعلق بیان کیا ہے۔ کسی بھی عظیم نصیب العین کے حامل کو اپنے نصیب العین کے لیے ثابت قدمی اور مستقل مزاجی کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے۔ اور ایسے ہی لوگوں کا نصب العین مشتہر ہوتا ہے اور یہی لوگ کامیابی سے ہم کنار ہوتے ہیں۔ سقراط یونان کا مشہور فلاسفر تھا۔ حکام کے خلاف اُس نے آواز بلند کی اور عدل وانصاف کا نعرہ لگایا۔ تاہم زہر کے پیالے نے اُسے ابدی نیند سلا دیا۔ لیکن یہ بات قابل ذکر ہے کہ موت سے پہلے اُس کے حامی چند نوجوان تھے۔ لیکن موت کے بعد یونان کا ایک بڑا طبقہ اس کا حامی بن گیا۔ گویا سقراط نے اپنی جان قربان کرنے کے عوض اپنے نظریات کو مروج کر دیا۔ لہٰذا عظیم نظریات ونصب العین کے روحِ رواں کو کسی چیز کی قربانی سے دریغ نہیں کرنا چاہیے۔ بقول سید ضیاء الدین نعیم:

سچ کے انعام ہیں بہت سارے
زہر کے جام ہیں بہت سارے

تشریح طلب شعر میں بھی شاعر نے اسی کیفیت کا اظہار کیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ ہمارا عزم چٹان کی طرح مضبوط ہے۔ ہم اپنے نظریات پر کسی عظیم پربت یا طویل پہاڑی سلسلے کی طرح ڈٹے ہوئے ہیں۔ مخالفین نے لاکھ کوشش کی، ہمیں قید وبند کی صعوبتیں دی گئیں، لالچ اور دھمکیاں دی گئیں، طرح طرح کے حربے آزمائے گئے کہ کسی طرح ہم اپنے نظریات کی ترویج کو خیر باد کہہ دیں۔ لیکن ہم جب کسی راہ پر چل پڑتے ہیں تو مانند کوہ گراں ڈٹ جاتے ہیں۔ جسے اگر ساری دنیا بھی ہلانا چاہے تو نہ ہلا سکے۔ اور ہم نے اشتراکی نظریات کی راہ لی ہے تو اب ہرگز اس سے نہیں ہٹیں گے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس راہ سے ہرگز انحراف نہیں کریں گے۔ تاہم سقراط کی مانند اپنے نظریات کے لیے جان بھی قربان کر دیں گے۔ اس طرح ہم نے اس راہ کو ایک ایک گام یادگار بنا دیا۔ ایک ایک قدم پر اولوالعزمی کی نئی داستان رقم کردی۔ کیوں کہ عزت کی موت مرنے والا حقیقت میں کبھی مرتا نہیں۔ اس کی آن بان اور شان ہمیشہ سلامت رہتی ہے۔ ایک اور جگہ فیض احمد فیض کہتے ہیں۔

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا، وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے، اس جاں کی تو کوئی بات نہیں

شاعر مزید کہتا ہے کہ ہمیں اپنی جان کے جانے کا چنداں افسوس نہیں کیوں کہ یہ ہم نے اپنے وطن پر قربان کی ہے۔

خونِ دل دے کے نکھاریں گے رُخِ برگِ گلاب
ہم نے گلشن کے تحفظ کی قسم کھائی ہے

شعر کا خارجی مفہوم یہ ہوگا کہ شاعر کہتا ہے کہ ہم نے حصول محبوب کے لیے قدم قدم پر مشکلات ومصائب ہے اور قدم قدم پر ایک نئی داستان وفا رقم کی ہے۔ رقیبوں نے ہماری راہ میں ہزار ہا رکاوٹیں کھڑی کیں لیکن ہم محبوب کے حصول کے لیے ڈٹے رہے اور آخر کار محبوب پر ہم نے جان ہی قربان کردی۔

غزل نمبر 2

شعر۔1 کب یاد میں تیرا ساتھ نہیں، کب ہات میں تیرا ہات نہیں
صد شکر کہ اپنی راتوں میں اب ہجر کی کوئی رات نہیں

حل لغت: ہات: ہاتھ
صد: سو، سینکڑہ
ہجر: فراق / جدائی

مفہوم: اے محبوب میری یادوں میں ترا ساتھ ہے اور میرے ہاتھوں میں تیرا ہاتھ ہے۔ اللہ کا بہت شکر ہے کہ میری راتوں میں اب جدائی کی کوئی رات نہیں۔

تشریح:
زیرِ تشریح شعر میں شاعر کہتا ہے کہ اگر چہ میں اب بالکل تنِ تنہا ہوتا ہوں، کوئی میرے آس پاس نہیں ہوتا اور محبوب سے جدائی کا زمانہ ہے۔ لیکن اصل میں ایسا نہیں ہے۔ کیوں کہ دورِ ہجر ہے لیکن یہ دورِ وصل بھی ہے۔ میں نے محبوب کی جدائی کے کٹھن لمحاتِ ہجر اور اذیت سے بچنے کے لیے ایک انوکھا طریقہ ڈھونڈا ہے کہ میں اس عالمِ تنہائی میں بھی محبوب کے خیالوں میں گم ہو جاتا ہوں۔ عالمِ تخیل میں، میں اپنے محبوب سے ہم کلام ہوتا ہوں۔ اور ہر وقت محبوب کی یاد میرے ذہن میں بس گئی ہے۔ اگر چہ جسمانی طور پر حالتِ فراق ہنوز جاری ہے۔ تاہم ذہنی و قلبی ہجر ختم ہو چکا ہے اور اب ذہنی اور قلبی طور پر میں محبوب کے وصال سے فیض یاب ہوں۔

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا ۔۔۔ جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

شاعر مزید کہتا ہے کہ اس طرح دن رات میں محبوب کی یاد میں مگن رہتا ہوں۔ اور شب کو بھی مجھے وصل کا احساس ہوتا ہے اور میں بالکل ایسے تصور کرتا ہوں جیسے اے محبوب تم میرے پاس بیٹھے ہو اور تمھارا ہاتھ میرے ہاتھ میں ہے چناں چہ اس کیفیت کو جدائی نہیں کہا جا سکتا۔ شاعر نے لفظ ''اب'' استعمال کیا ہے یعنی ماضی میں شاعر کو راتوں میں ہجر محسوس ہوتا تھا تاہم حال میں ایسا نہیں ہے، اب وہ اللہ کا شکر گزار ہے کہ اب کوئی شب، شب فراق نہیں۔ ایک اور جگہ فیض کہتے ہیں:

بزمِ خیال میں ترے حسن کی شمع جل گئی ۔۔۔ درد کا چاند بجھ گیا، ہجر کی رات ڈھل گئی

زیرِ تشریح شعر میں دراصل فیض محبوب کے پردے میں وطن سے مخاطب ہے کیوں کہ انھوں نے وطن کو محبوب کا درجہ دے رکھا تھا۔ یہ شعر اُن کے زمانۂ جلاوطنی کی کیفیت کا غماز ہے۔ کیوں کہ ایک دور تھا کہ حکام نے انھیں ملک و ملت کا باغی قرار دے کر جلاوطن کر دیا تھا۔ لیکن فیض تو وہ شاعر ہیں جو فنافی المحبوب کی بجائے فنافی الحب الوطنی کے رُتبے پر فائز تھے۔

وہ کہتے ہیں کہ جلاوطنی کے زمانے میں ہر وقت میں وطن کو یاد کرتا رہتا ہوں۔ ملک کی کچی گلیاں جو عوام کی حق تلفی کی غماز ہیں۔ ملک کے استحصال زدہ مزدور جو امراء کے عیش کی بھینٹ چڑھ رہے ہیں، اور حکمرانوں کے تاج محل جن کی بنیادوں میں غریبوں اور مزدوروں کا لہو ہے، میری آنکھوں کے سامنے گھوم جاتے ہیں۔ وطن کی یاد مجھے ستاتی رہتی ہے، اگر چہ میں وطن سے کوسوں دور بیٹھا ہوں، تاہم عالمِ تخیل میں وطن میں ہی ہوتا ہوں، رات کے وقت بھی میں اپنے دل کو یادِ وطن سے بہلاتا ہوں۔ اس طرح اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میری راتیں بھی یادِ وطن سے معمور ہیں اور میں ہجرِ وطن کے غم کو فراموش کر بیٹھا ہوں۔ بقول شاعر

خیالوں ہی میں اکثر بیٹھے بیٹھے ۔۔۔ بسا لیتا ہوں اک دنیا سہانی

دنیا بھر کی بھولی یادیں مجھ سے ملنے آتی ہیں ۔۔۔ شام سے اس سونے گھر میں میلا سا لگ جاتا ہے

شعر 2: مشکل ہیں اگر حالات وہاں، دل بیچ آئیں جاں دے آئیں ۔۔۔ دل والو! کوچہ جاناں میں کیا ایسے بھی حالات نہیں

(گوجرانوالہ 2008، ملتان، لاہور 2007)

حل لغت: مشکل حالات: ناسازگار حالات　بیچنا: فروخت کرنا　کوچۂ جاناں: محبوب کی گلی

مفہوم: محبوب کی گلی میں جانا اگر مشکل ہے تو اے عشاق ہمیں چاہیے کہ دل اور جان کی بازی لگا دیں۔

تشریح:

تشریح طلب شعر میں شاعر دل والوں سے مخاطب ہے۔ شاعر نے اس شعر میں اُن لوگوں کو ''دل والو'' کہا ہے جن کا دل زندہ ہے۔ شاعر مردہ دل والوں کو بے دل شمار کرتا ہے۔ یہی نظریہ اقبال کا بھی ہے۔ بقولِ اقبال:

دلِ مردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارا　　کہ یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارا

ایسے لوگ جن پر کلامِ حق اثر نہیں کرتا جو لوگ شاعر کے سچے نظریات کو نہیں مانتے وہی لوگ مردہ دل ہیں۔
دوسرے الفاظ میں شاعر اپنے حامیوں یا دوستوں کو دل والے کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ حالت جلاوطنی میں ان کے دوست انھیں بتاتے ہیں کہ اس وقت وطن کے حالات نہایت پرخطر ہیں۔ ان حالات میں وطن واپس آنا بہت خطرناک ہے۔ چناں چہ فیض استفہامیہ انداز میں اپنے دوستوں سے پوچھتے ہیں کہ میرے وطن کے اتنے پرخطر اور مخدوش حالات ہیں کہ وہاں اپنے دل و جان بھی اپنے وطن پر قربان نہیں کر سکتے۔

چناں چہ وہ کہتے ہیں کہ میرے دوستو! اگر آج ملکی حالات کڑے ہیں تو کیا غم ہے؟ اگر ظالم و جابر طبقہ برسرِ اقتدار ہے اور ہم جیسے حق کے علمبرداروں کی جان کے درپے ہے تو گھبرانے کی کیا بات ہے۔ کیوں کہ علمبردارانِ حق کو ہمیشہ ایسے ہی حالات سے واسطہ پڑتا ہے۔ ظلم وستم کا خاتمہ چاہنے والوں کا ظلم وستم سے سابقہ پڑنا ناگزیر ہے۔ لیکن ہم بھی تو دل اور جان کے نذرانے پیش کرنے کے لیے تیار ہیں۔ بقولِ ایوب اختر:

صداقت کے جو پیکر ہوں لٹا دیتے ہیں جاں اختر　　مگر جابر کے آگے سر کبھی وہ خم نہیں کرتے

وطن کے حالات چاہے جتنے ہی ہمارے خلاف کیوں نہ ہوں لیکن ہمارے دل اور جان کے نذرانے کے سامنے وہ بھی ہیچ ہیں۔ کیوں کہ مخالفین زیادہ سے زیادہ کر بھی کیا سکتے ہیں۔ یہی کہ ہمیں زندگی سے محروم کر دیں گے یعنی موت کی آغوش میں سُلا دیں گے۔ تو اُس کے لیے تو ہم پہلے ہی سے تیار ہیں اور وطن کی راہ میں جدوجہد کرتے ہوئے جان قربان کرنا ویسے ہی ہمارے لیے باعثِ فخر ہے۔ تو پھر ہمیں وطن کے حالات سے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ کیوں کہ دل و جان تو ہم فخریہ طور پر وطن پر قربان کر رہے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں شاعر کہہ رہا ہے کہ وہ راہِ جدوجہد میں ہر طرح کی قربانی دیں گے اور اس کے ساتھ ساتھ بڑے دھیمے اور پُراثر لہجے میں وہ اپنے دوستوں کو آمروں اور غاصبوں کے خلاف جدوجہد اور بغاوت پر آمادہ کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ شاعر نے دبے الفاظ میں حکمرانوں کی بربریت پر نالہ و فریاد بھی کی ہے۔ بقولِ شاعر:

شاید کبھی تو دیکھے گا وہ تم کو جھانک کر　　اس کی گلی میں روز تماشا کیا کرو

خارجی اعتبار سے شاعر نے دل والے اُن عشاق کو کہا ہے جو محبوب کو حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ محبوب کی گلی میں جانے سے ڈرنا بے سود ہے کیوں کہ ہم نے تو محبوب پر دل و جان نچھاور کرنے کا عہد کیا ہوا ہے تو پھر لوگوں اور رقیبوں کا خوف کیا معنی رکھتا ہے۔ یعنی وہ عاشقوں کو بے خوف و خطر محبوب کی گلی میں جانے کا درس دے رہے ہیں تاکہ حصولِ محبوب آسان ہو سکے۔ بقولِ یعقوب انجم:

سب کو پیاری ہے زندگی لیکن　　تم ہمیں زندگی سے پیارے تھے

شعر 3 جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے — یہ جان تو آنی جانی ہے اس جاں کی تو کوئی بات نہیں

(گوجرانوالہ 2008ء، ملتان، لاہور 2007، سرگودھا 2013ء)

حل لغت:

دھج: انداز، طریقہ، سجاوٹ — مقتل: قتل گاہ — سلامت: زندہ

آنی جانی: عارضی، ختم ہونے والی

مفہوم:
یہ جان تو فانی ہے اور اُسے جانا ہے لیکن جو جس شان سے موت کو گلے لگاتے ہیں وہ شان زندہ رہتی ہے

تشریح:

تشریح طلب شعر میں شاعر نے زندگی کی بے ثباتی اور ناپائیداری کا ذکر کیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ جان آخر ایک روز چلی جانی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کوئی میدان جنگ میں جان سپردِ الٰہی کر دے یا کوئی بڑھاپے میں بسترِ مرگ پر لیٹا ہوا ختم ہو جائے۔ موت ایک ایسی اٹل حقیقت ہے کہ آج تک جس کا کوئی بھی انکار نہیں کر سکا۔ شاعر زندگی کے فانی ہونے کا اظہار کر کے، بلند نصب العین، مقصد یا نظریے کے روح رواں لوگوں کو قربانی دینے کی ترغیب دے رہا ہے۔ اکثر اوقات اعلیٰ نصب العین اور اعلیٰ مقاصد کے حامل لوگوں کے نظریات حکام سے متصادم ہوتے ہیں کیوں کہ عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ حکمرانوں کا طبقہ اکثر لاپروا، غافل عیش کوش اور حق تلف واقع ہوا ہے۔ ظالم اور جابر طبقہ کی طرف سے حق کے علمبرداروں کو کبھی تو پیسے کا لالچ دیا جاتا ہے یا قید و بند کی صعوبتیں دی جاتی ہیں یا پھر تختۂ دار پر لٹکا دیا جاتا ہے۔ بقول شاعر:

رحم کی بھیک نہ مانگوں گا کسی بھی صورت — مثلِ منصور مجھے دار پہ لایا جائے

سب سے پہلے تو انعام و کرام کا لالچ دیا جاتا ہے بعض تو بخوشی قبول کر لیتے ہیں اور بعض اپنے نظریے پر ڈٹے رہتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ان لوگوں کو طرح طرح کی تکالیف دی جاتی ہیں، بعض تو مصائب کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتے ہیں جب کہ کچھ ثابت قدم رہتے ہیں اور نصب العین کے سامنے کسی کو خاطر میں نہیں لاتے۔ جس کی پاداش میں انھیں طرح طرح کی صعوبتیں اور اذیتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں اور کڑی سے کڑی آزمائشوں سے سابقہ پڑتا ہے اور تختہ دار پر بھی جھولنا پڑتا ہے۔ حتیٰ کہ ایسے ہی لوگوں کو پھانسی کا پھندا پہننا پڑتا ہے۔ چناں چہ جس حوصلے، عظمت، شان اور آن بان سے تختۂ دار یا قتل گاہ کی طرف جاتے ہیں، وہ شان و شوکت، عظمت، انھیں زندہ و جاوید اور امر کر دیتی ہے۔ شاعر کے بقول جان تو ویسے بھی لمحاتی اور عارضی ہے اور جس انداز اور ڈھنگ سے کوئی جان دیتا ہے وہ انداز لوگوں کے دلوں پر نقش ہو جاتا ہے۔ وہ انداز لوگوں کے لیے مثال بن جاتا ہے۔ جس کا مظاہرہ انھوں نے تختہ دار پر کیا ہوتا ہے۔ بقولِ صغیر احمد صغیر:

ہنستا ہوا اک شخص گیا دار کی جانب — حیران کھڑی خلقِ خدا دیکھ رہی تھی

چناں چہ فیض کہتے ہیں کہ ہم اپنے نصب العین پر ثابت قدم رہیں گے اور خود بخود ایک پُروقار انداز سے پھندا گلے میں پہن لیں گے۔ کیوں کہ پُروقار اور شان دار موت مرنے والے تاریخ کے صفحات میں ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ حضرت امام حسینؓ نے 72 افراد کے ساتھ میدان جہاد میں جام شہادت نوش فرمایا اور آج کا بچہ بچہ انھیں جانتا ہے۔ منصور حلاج مشہور صوفی بزرگ تھا۔ اُس نے انا الحق (میں خدا ہوں) کا نعرہ لگایا۔ خلیفہ مقتدر عباسی نے اُسے پھانسی پر لٹکانے کا حکم دیا۔ تاہم حیران کن پہلو یہ ہے کہ منصور خود ہنستا ہوا آیا اور انا الحق کا نعرہ لگاتے ہوئے خود بخود اپنے آپ کو جلاد کے سپرد کر دیا۔ اس شان سے جان دی کہ آج تاریخ کے صفحات پر زندہ ہے۔

نام منصور کا ہے آج بھی زندہ دیکھو — جس نے کھینچا تھا اُسے دار پہ، ہے آج کہاں؟

ایسے ہی لوگ فی الحقیقت ہمیشہ کے لیے زندہ رہتے ہیں ورنہ اکثر لوگ جو موت سے خوف زدہ ہوتے ہیں گمنام موت مرجاتے ہیں۔ بقول شاعر:

کہاں گئے وہ لاکھوں مرگِ خاموش انسان — خاک میں مل گئے، مٹ گیا نام ونشاں
حسینؓ و حمزہؓ نے پائی ہے ابدی حیات — رہتا ہے عالم میں اسمِ شہداء عیاں

شعر 4 میدانِ وفا دربار نہیں، یاں نام ونسب کی پوچھ کہاں — عاشق تو کسی کا نام نہیں، کچھ عشق کسی کی ذات نہیں

(گوجرانوالہ 2008ء ملتان، لاہور 2007، سرگودھا 2013ء)

حل لغت: میدانِ وفا: عشق کا میدان — نام ونسب: باپ دادا کے سلسلے کی وجہ سے عزت یا رتبہ
ذات: قوم — دربار: بادشاہ کی محفل یا دربار

مفہوم: عشق کا میدان بادشاہ کا دربار نہیں جہاں سلسلہ نسب کی پوچھ گچھ ہوتی ہے۔ عاشق کسی کا نام نہیں اور نہ ہی عشق کسی کی ذات ہے۔

تشریح:

زمانہ قدیم میں بادشاہ جب کسی کو مقام ومرتبہ تفویض کرتے، تو بعض باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے مراتب کی تقسیم کی جاتی تھی۔ سب سے پہلے یہ دیکھا جاتا تھا کہ جس کو مرتبہ عطا کیا جارہا ہے، وہ کس خاندان کا چشم وچراغ ہے اور ماضی میں اس کے خاندان کا معاشی اور سیاسی حیثیت سے کیا مقام رہا ہے۔ گویا حسب نسب کے اعتبار سے عہدے تقسیم ہوتے تھے۔ یعنی معاشرتی اعتبار سے ناانصافی ہورہی تھی۔ اگر کوئی شخص سلطنت کا وفادار ہوتا تو اُسے محض اس لیے ٹھکرادیا جاتا کہ اس کے خاندان کے فلاں شخص نے بادشاہ کے ساتھ کامل وفاداری کا ثبوت نہیں دیا تھا۔

لیکن فیض احمد فیض کہتے ہیں کہ عشق کا میدان بادشاہوں کا دربار نہیں کہ جہاں مراتب عطا کرتے وقت شاہی قربت یا سلسلۂ نسب اور آباؤاجداد کو ملحوظ رکھا جاتا ہو۔ بلکہ یہ ایک ایسا میدان ہے جہاں ہر کوئی قسمت آزمائی کرسکتا ہے لیکن وفادار ہونا شرط ہے۔ امراء وغرباء کے لیے برابر دروازے کھلے ہیں۔ کیوں کہ عشق کے پلڑے میں وفا کا باٹ استعمال ہوتا ہے، یہاں تو وفا کا سکہ چلتا ہے۔ فرہاد ہی کو دیکھ لیجیے خود ایک غریب دشت نورد تھا لیکن خسرو پرویز کی ملکہ شیریں پر عاشق ہوگیا۔ کہاں ملکہ اور کہاں یہ آوارہ مزاج پھٹا پرانا لباس پہننے والا۔ یہ ہے مساواتِ عشق اور نہ ہی یہاں سلسلہ نسب کے بارے میں پوچھا جاتا ہے۔ آیا کہ اُس کا باپ بھی عاشق تھا یا کبھی راہِ عشق میں الجھا ہی نہیں۔ بقول صغیر احمد صغیر:

ہم نے مجنوں سے سنا تھا کبھی صدیوں پہلے — عشق ہوجائے تو نسبت نہیں دیکھی جاتی

دراصل میدانِ عشق ایسے قوانین سے مبرا ہے۔ مزید براں عاشق کسی کا نام بھی نہیں ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے کہ کوئی اپنا نام عاشق رکھ لے تو اُسے عشق کے میدان میں کامیابی ہوگی۔ نہ ہی عاشقوں کی کوئی قوم ہے کہ فلاں قوم عشاق کی ہے۔ جس کے تمام افراد ہی راہِ عشق کے راہی ہیں۔ نہیں بلکہ یہ خام خیالی ہے مولانا حالی نے کہا تھا:

قیس ہو، کوہ کن ہو یا حالی — عاشقی کچھ کسی کی ذات نہیں
سارا کلیجہ کٹ کٹ کر جب اشکوں میں بہہ جائے ہے — تب کوئی فرہاد بنے ہے، تب مجنوں کہلائے ہے

داخلی اعتبار سے فیض کہتے ہیں کہ اپنے وطن سے ہر کوئی محبت کرسکتا ہے۔ اس میں کوئی سلسلۂ نسب کی پوچھ گچھ نہیں۔ غریب اور امراء کے لیے وطن سے محبت کے یکساں مواقع ہیں۔ وطن سے محبت ہر شہری کا فرض ہے جو وطن کا حق ہے۔ لیکن قوانین وہی

عشق والے لاگو ہوتے ہیں۔ محبِ وطن کو وفادار اور انصاف کا علمبردار ہونا چاہیے۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ ملک صرف امرا، حکام، رؤسا اور جاگیرداروں کا ہے۔ ملک کو اپنا سمجھنا ان لوگوں کی صریح غلط فہمی اور خام خیالی ہے۔ نظرِ غائر سے دیکھا جائے تو یہ عیاں ہوتا ہے کہ وطن کی خاطر عام لوگ زیادہ دکھ جھیلتے ہیں۔ ایک شاعر عام لوگوں کی کیفیت یوں بیان کرتا ہے۔

ہم محبت کی انتہا کے لیے ۔۔۔ انتہائے حیات سے گزرے

شعر 5 گر بازی عشق کی بازی ہے جو چاہو لگا دو ڈر کیسا ۔۔۔ گر جیت گئے تو کیا کہنا، ہارے بھی تو بازی مات نہیں

(گوجرانوالہ 2008ء، ملتان، لاہور 2007، سرگودھا 2013ء)

حل لغت: بازی: کھیل، داؤ ۔۔۔ مات: ہار، شکست

مفہوم: اگر عشق کی بازی ہے تو بے خطر جان کی بازی لگا دو کیوں کہ اگر جیت گئے تو خوب اگر ہار گئے تو بھی اس ہار کو شکست نہیں کہا جا سکتا۔

تشریح: تشریح طلب شعر میں فیض نے عاشقوں کو جان کی قربانی دینے کی ترغیب دی ہے۔ چناں چہ کہتے ہیں کہ محبوب کی خاطر جان قربان کرنے سے بھی دریغ نہیں کرنا چاہیے۔ کیوں کہ راہِ عشق میں وہی لوگ سرخرو ہوتے ہیں جو سر پر کفن باندھ کر نکلتے ہیں۔ جو جان ہتھیلی پر رکھ کر میدانِ وفا میں وفا ثابت کرنے آتے ہیں، تاہم بعض عشاق محبوب کی راہ میں جان قربان کرنے سے ہچکچاتے ہیں۔ شاعر اُن سے مخاطب ہے کہ اے جان نثارو! عشق کی بازی لگاتے ہوئے تمھیں ہرگز جان قربان کرتے ہوئے ہچکچانا نہیں چاہیے اور نہ ہی سوچوں کے منجدھار میں الجھنا چاہیے۔ بلکہ اس میدان میں بلا سوچے سمجھے بے خوف و خطر سر پر کفن پہن کر کود پڑنا چاہیے۔ کیوں کہ یہ دنیا کی واحد بازی ہے جس میں شکست کے مواقع نہیں ہیں۔ اگر تم نے محبوب کو پا لیا تو سونے پر سہاگہ اور اگر جان قربان کر دی تو پھر بھی گھاٹے کا سودا نہیں کیوں کہ محبوب کی نظر میں تمھاری وقعت بڑھ جائے گی اور تمھاری وفاداری پر مہر ثبت ہو جائے گی۔ پروین شاکر کہتی ہیں:

اس شرط پہ کھیلوں گی پیا پیار کی بازی ۔۔۔ جیتوں تو تجھے پاؤں ہاروں تو پیا تیری

حقیقت میں شاعر نے محبوب کے پردے میں وطن کے لیے جان کا نذرانہ پیش کرنے کی تلقین کی ہے۔ شاعر وطن سے محبت کرنے والوں سے مخاطب ہے کہ ملک کے مشکل حالات دیکھ کر تمھیں گھبرانا نہیں چاہیے۔ ظلم و ستم کا بازار گرم دیکھ کر جان کے خوف سے ظلم کے سامنے گھٹنے نہیں ٹیکنے چاہئیں، اس خوف سے اپنے بلند نصب العین اور اعلیٰ مقاصد سے دست بردار نہیں ہونا چاہیے کہ جابروں اور ظالموں کے خلاف آواز اٹھانے سے ہمارا جسد و روح کا سلسلہ منقطع نہ کر دیا جائے۔

شاعر کہتا ہے کہ تمھیں بلا سوچے سمجھے وطن کی خاطر جان قربان کر دینی چاہیے۔ کیوں کہ اس راہ میں ہر طرح سے تمھاری جیت ہے۔ اگر تم اپنے مقصد اور نصب العین کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تو سونے پر سہاگہ اور تمھاری عمر بھر کی جدوجہد اور کوشش رنگ لائی۔ لیکن اگر تمھیں وطن کی خاطر قربانی دینا پڑے تو یہ ہرگز نہ سمجھنا کہ تم ہار گئے تو کیا ہوگا بلکہ جیت پھر بھی تمھاری ہی ہوگی کیوں کہ ایک تو یہ کہ تاریخ تمھارا نام ہمیشہ زندہ رکھے گی اور تمھارا نام سنہری حروف میں لکھا جائے گا۔ دوسرا ناکامی کامیابی کا پہلا زینہ ہے۔ تمھاری شہادت کے بعد مزید اولوالعزم اور جاں نثار تمھاری جگہ لیں گے اور تمھارے نصب العین کو کامیابی سے سرفراز کریں گے۔ بقول شاعر:

بے خطر کود پڑا آتش میں ۔۔۔ عقل ہے مشورہ نہیں کرنا

حضرت امام حسینؓ نے اسلام کی سربلندی کے لیے جان قربان کی اور آج ایک طرف تو عالم اسلام کا بچہ بچہ اُن کی شان میں رطب اللساں ہے۔ تو دوسری طرف اُن کی شہادت کے بعد ہاشمی عنصر زور پکڑتا گیا اور آخر کار ہاشمیوں کی ایک شاخ عباسیوں نے اموی آمریت (یزید اموی تھا) کا خاتمہ کر دیا۔ یعنی اُن کی شہادت کے بعد اُن کا نصب العین تیزی سے پھیل گیا۔ اسی لیے شاعر نے کہا ہے۔

دل ٹوٹ بھی جائے تو محبت نہیں مٹتی ۔۔۔ اس راہ میں لٹ کر بھی خسارا نہیں ہوتا

مشق

1۔ درست جواب کے آگے (✓) نشان لگائیں۔

(i) غزل نمبر 1 میں ردیف ہے۔

(الف) دیا ✓ (ب) گنوا (ج) گنوا دیا (د) گنوا مالٹا

(ii) فیض احمد فیض کی وجہِ شہرت ہے۔

(الف) تنقید (ب) مضمون نگاری (ج) شاعری ✓ (د) افسانہ نگاری

2۔ مندرجہ ذیل الفاظ و تراکیب کی وضاحت کیجیے۔

الفاظ و تراکیب	وضاحت
ناوکِ نیم کش	آدھ کھنچا ہوا تیر، جو تیر مکمل زور لگا کر نہ چلایا جائے، محبوب کی آدھ کھلی آنکھیں
چارہ گر	معالج، مسیحا، خیر خواہ، محبوب
غرورِ عشق کا بانکپن	عشق کا البیلا پن، عاشقی کا نشہ
کوہِ گراں	طویل اور بلند پہاڑ، اپنے موقف اور مقصد پر ڈٹ جانے والا شخص
مقتل	قتل گاہ، قربان گاہ

3۔ قافیہ اور ردیف کی تعریف لکھیں اور غزلیات فیض سے ایک ایک مثال دیں۔

ج قواعد و انشا کے حصے میں ملاحظہ ہوں۔

4۔ مطلع اور مقطع کا فرق واضح کریں اور مثال بھی دیں۔

ج قواعد و انشا حصے میں ملاحظہ ہوں۔

5۔ اشعار کی تشریح کریں۔

ج دیکھیے اشعار کی تشریح۔